اقبال اور میر: تقابلی مطالعے کی چند جہتیں

محمد رؤف

Muhammad Rauf

Lecturer, Department of Urdu,

Govt. Post Graduate College, Samanabad, Faisalaabd.

Abstract:

Mir Taqi Mir and Allama Muhammad Iqbal both are the well known representatives of their contemporary poetics in Urdu poetry. There is a great difference in thinking pattern and poetic diction between the two and hence each of them has his own specific literary recognisation. That is why, any comparison between the two is considered to be a, Mukabara (مکابرہ). On the other hand, we can feel a delicate resemblance between the internal structure of their poetry. In this article an attempt has been made to highlight the same similarities among their creations.

اردو شاعری کی تاریخ سے اگر ہم فی صدی ایک شاعر کا انتخاب کرنا چاہیں تو ہماری نگہۂ انتخاب یقیناً ولؔی، میرؔ، غالبؔ اور اقبال جیسے بلند قامت شاعروں پر آ کر ٹھہرے گی۔ ان تمام شعرا نے اپنے اپنے دور کی شعریات کو تخلیقی پیراہن عطا کرنے میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر ادبی مؤرخ انھیں نمائندہ حیثیت دیتا نظر آتا ہے۔ بلاشبہ ان شعرا میں سے ہر کسی کا معاصر سیاسی و سماجی منظر نامہ دوسرے سے مختلف تھا اور بنا بریں ان کی تخلیقات میں روبہ عمل شعریاتی فضا کا باہمی امتیاز انھیں ''موازنۂ انیس و دبیر'' کی طرز پر ایک دوسرے کے سامنے رکھ کر تقابلی تنقید کے لیے ناموزوں بنا دیتا ہے۔ اردو غزل کی شعریات کا ارتقائی شعور ہمیں بہ خوبی یہ باور کروانے کے لیے کافی ہے کہ یہ صنفِ سخن ہر دور میں اپنے متن کی تشکیل و تعبیر کے لیے نئے نئے پیرامیٹرز کے زیرِ اثر رہی ہے۔ اس کا ہر دور اپنے فکری موضوعات، انتخابِ لفظیات اور رمزیہ نظام کے حوالے سے کچھ نہ کچھ امتیازی خدوخال ضرور واضح کرتا رہا ہے۔ لہٰذا مختلف ادبی ادوار سے منسلک شاعروں کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے اس شعریاتی افتراک کو ضرور مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ضیاء الحسن بہ جا طور پر لکھتے ہیں کہ:

''میر کی شاعری کے تنقیدی پیمانے پر غالب اور کلاسیکل غزل کے پیمانے پر
اقبال شاعر ہی نہیں ٹھہرتے۔''(۱)

دراصل اعتباری قدر بندی کی غرض سے جب کوئی سے دو شاعروں کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے تو ہمیں سابقہ تجربات کی روشنی میں کچھ نئے ادبی حقائق بھی طے کرنا پڑتے ہیں کیوں کہ مختلف اسالیب اور طرزِ فکر کے حامل شعرا میں سے قارئین کے لیے کسی ایک کی ترجیحاتی پسندیدگی کے پیمانے مختلف ہو سکتے ہیں لہٰذا ایسے میں معروضی استخراجِ نتائج کے لیے اس بات پر توجہ مرکوز کرنا لازم ہے کہ اقلیم ادب میں روبہ عمل شعریاتی قدریں مستقل (Consonants) بھی ہوتی ہیں اور تغیر پذیر (Variables) بھی، نیز ان میں مستقل اقدار و روایات کی تعداد متغیرات کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے۔ اب دو شعرا کے تقابلی جائزے میں ان متغیرات کو نظر میں رکھتے ہوئے بالعموم ان کے ادبی متون کو انھی مستقل اقدار کی روشنی میں تعینِ مراتب کے عمل سے گزارا جاتا ہے، مثلاً اردو کے سب سے بڑے شاعر کا انتخاب کرتے ہوئے ہمیں ان متغیرات کو نظر میں رکھنا ہوگا کہ:

(i) اردو کی ادبی شعریات میں ''بڑی شاعری'' کا پیمانہ کیا رہا ہے؟

(ii) ہماری شعریات کا ارتقائی منظر نامہ کیا ہے نیز اس کے مختلف ارتقائی ادوار میں اشتراکی رشتہ کیسا رہا ہے؟

(iii) ہماری شعری روایت میں بڑے شاعر کون کون سے ہوئے ہیں اور ہمارے مجموعی شعریاتی نظام کی مشترکہ قدروں پر ان کی تخلیقی گرفت کیسی رہی ہے؟

ظاہر ہے کہ ان ضوابط کی پاس داری کرتے ہوئے دو مختلف شعریاتی تناظرات کے حامل شعرا کی تقابلی اعتباریت طے کرنا خاصا پیچیدہ عمل ہوگا اور اس میں معروضیت لانا بھی اکثر اوقات ناممکن محسوس ہونے لگتا ہے۔ چناں چہ ایسے ہی مواقع پر ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است'' کی معقول منطق پیش کی جاتی ہے۔ میر اور اقبال کے ادبی مراتب کی تقابلی تعین کاری کا معاملہ بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ کے نمائندہ شاعروں میں سے ____ بالخصوص جن چار شعرا کا تذکرہ مضمون کے شروع میں کیا گیا ہے ____ ہر کوئی ''رنگ و بوئے دیگر'' کا حامل اور بنا بریں ''ہم چوں ما دیگرے نیست'' کی دعویٰ داری کا حق دار ہے مگر ان میں سے خدائے سخن میر تقی میر اور شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال کا باہمی تفاوت خاص طور پر نمایاں ہے۔ میر سے غالب کا زمانی فاصلہ زیادہ نہ سہی مگر یہ امر واقعہ ہے کہ مرزا کے عہد میں ہمارا تہذیبی تشخص ایک نئی کروٹ ضرور لینے لگا تھا، لہٰذا سماجی فکر و فلسفے کے جو عناصر میر کے ہاں نہایت منتشر اور بے ربط حالت میں ہیں، غالب تک آتے آتے اپنے مربوط خدوخال واضح کرنے لگتے تھے۔ میر کو ایسی عمرانی الجھنوں سے ہرگز سابقہ نہ رہا تھا جن کی پیشوائی مرزا کو کرنا پڑی، لہٰذا مذکورہ دونوں شاعروں کے طرزِ احساس اور زاویۂ نظر میں فرق کا درآنا یقینی تھا۔ اسی طرح عہد اقبال کا

مرزا کے زمانے سے مابہ الامتیاز بڑا نمایاں ہے کہ اس میں مشرق کی گراں خواب اقوام سنبھلنے اور خود کو سیاسی سطحوں پر متحرک بنانے میں پوری طرح جُت گئی تھیں۔اس تیزی سے بدلتے ہوئے سماجی منظر نامے کی ارتقائی کڑیوں میں سے اگر ہم مرزا غالب کو نظر انداز کر کے میر اور اقبال کو باہم رکھ کر تقابلی طور پر دیکھنا چاہیں تو ان کے مابین فکر و نظر کی اختلافی خلیج اور بھی زیادہ گہرائی یا گیرائی کی حامل ٹھہرتی ہے۔ بلاشبہ ان دونوں شاعروں کے طرزِ احساس اور اندازِ نظر کا یہ فرق اپنے عقب میں ایک مضبوط تعقلاتی فریم ورک بھی رکھتا ہے مگر بہ ایں ہمہ ان میں ایک لطیف ارتباطی رشتہ بھی بہ ہر حال موجود ہے اور فکر و فن کا یہ اشتراکی پہلو ان کے شعریاتی متغیرات کے بین السطور روبہ عمل ان مستقل ادبی قدروں سے جنم لیتا ہے جس کا اوپر قدرے مفصل انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔اس ضمن میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

> ''یہ ایک حقیقت ہے کہ شعر میں فکر کو جذبہ بنانے کی روایت جو میر سے شروع ہوئی تھی، اقبال کے یہاں ایک پورے نظام فکر یا System of Thought کو جذبہ بنانے کی صورت میں ظاہر ہوئی۔''(۲)

میر کا زمانہ اردو غزل کا سنہری دور قرار دیا جاتا ہے جب کہ اقبال کی شاعری ایک ایسے سماجی ماحول میں پروان چڑھی جب اس صنفِ سخن کو اس کی ریزہ خیالی کے بہ موجب نیم وحشی خیال کرتے ہوئے اقلیمِ ادب سے بارہ پتھر باہر کیا جا رہا تھا اور اس کے ادبی سنگھاسن پر نظم نگاری کا بہ تدریج قبضہ ہو چلا تھا۔اس متبدل تناظر میں میر اگر غزل کے بے بدل شاعر تھے تو ادھر اقبال نے نظم گوئی میں اپنی حاکمیت مسلّم کر رکھی تھی۔ اس ہیئتی فرق کے علاوہ مذکورہ دونوں شعرا کے مابین ایک بنیادی نوعیت کا فکری اختلاف یہ بھی رہا تھا کہ اول الذکر کے ہاں دروں بینی (Introversion)، تحمل مزاجی اور انفرادیت پسندی کا رجحان غالب ہے جب کہ موخّر الذکر کے کلام میں بیروں بینی (Extroversion)، اضطرابیت اور اجتماعیت نمایاں ہے۔عہد میر میں ہمارے شعری رویے زیادہ تر تھیم کو حاوی محرک کے طور پر قبول کیے ہوئے تھے جب کہ اقبال تک آتے آتے ہماری شعریات آئیڈیالوجی کے زیرِ اثر رہنے لگی۔ اگرچہ عہد اقبال کی مذکورہ اجتماعیت پرستی کے شروعاتی آثار عام طور پر مرزا غالب کے ہاں تلاش کیے جاتے ہیں مگر اقبال تک آتے آتے یہ رجحان ایک پُر زور تحریک کی شکل اختیار کر گیا جسے ترقی پسند گروہ نے مزید مستحکم بنا دیا تھا۔

میر اور اقبال میں فکر و فن کے اختلافات کی باہمی خلیج کو وسیع تر کرنے میں ہماری روایتی اور مدرسی تنقید نے بھی ایک کلیدی کردار ادا کیا ہے۔مولانا محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں میر کے کلام کو ''آہ'' قرار دیا تو ایسے میں ادبی میں فارمولا سازی اور فکری حد بندیوں کے شائقین اس سہل یافت نتیجے کو لے اڑے اور اس پر حاشیہ آرائی کا ایسا طومار باندھا کہ میر کا صدرنگ تخلیقی وجود ہمارے ادبی دستِ احساس پر ابھرا ہوا ایک آبلۂ غم بن کر رہ گیا۔ادھر اقبال پرستوں کی ایک ایسی جماعت بھی فعال رہی جس

نے ان کی ذات کو مقصدیت پرست فلسفی اور مصلح محض ثابت کرنے میں اپنی پوری توانائیاں صرف کر دیں۔ بلاشبہ مذکورہ شعرا کے بارے میں ایسی آرا قاعدۂ کثیریہ کے مطابق درست اور قابلِ اعتبار ہیں مگر ایسی دوٹوک قواعد پرستی سے کسی بڑے شاعر کی دیگر نوع بہ نوع فکری وفنی جہات کے پردۂ اخفا میں جا گرنے کا قوی احتمال بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ میر اور اقبال کے مابین قطعینی اختلافات دیکھنے والے بھی دراصل اسی نوع کی فارمولائی نقد ونظر سے متاثر نظر آتے ہیں ورنہ امر واقعہ یہ ہے کہ اقبال نے اپنی مجموعی ادبی روایت کو کام میں لا کر جو تخلیقی سرمایہ فراہم کیا ہے اس میں میریائی اثرات کو بھی شعوریا لاشعوری طور پر ضرور قبول کیا گیا ہے۔

بلاشبہ میر کسی خاص نظریے یا آدرش کا شاعر نہیں اور یہی آزادہ روی انھیں بادی النظر میں اقبال سے مختلف بل کہ ایک لحاظ سے ان کے ساتھ ثنویتی اختلاف (Binery Opposition) بنانے والا شاعر بھی ظاہر کرتی ہے تاہم ذرا غور کیا جائے تو نفس الامر میں یہ اختلاف اس قدر شدید ہرگز نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ علامہ نے ''خدائے سخن'' کے نہایت پرعظمت لقب کے حامل اس شاعر کی شان میں کوئی ایسی قصیدہ گوئی نہیں کی جیسی مرزا غالب یا داغ دہلوی کے لیے روا رکھی گئی اور شاید وہ تقلیدی تاثر سے بچنے کے لیے دانستہ طور پر ایسا کرنا بھی نہ چاہتے تھے، جیسا کہ اس شعر سے واضح ہے:

از ستائش گستری بالا ترم پیش ہر دیواں فرو ناید سرم

شعر کے قرائن بتاتے ہیں کہ یہاں ''دیواں'' کا اشارہ دیوان میر کی طرف ہے کہ جسے ان کے پیش رو شعرا ایک تخلیقی منشور اور فنی معیار کے طور پر سامنے رکھتے اور اس سے فکری وفنی رہ نمائی لیتے تھے۔ حافظ فضل الرحمٰن انصاری کے نام اپنے ایک خط میں اقبال نے میر کے شر: ''میر کیا سادہ ہیں۔۔۔'' کا حوالہ بھی دیا ہے مگر اپنے متعینہ مقاصد کے حصول اور معاصر زمانی تقاضوں کے پیشِ نظر وہ میریائی لیکوں پر چلنے کو تیار نہیں تھے۔ تاہم بہ ایں ہمہ مقاصد ومقتضیات انھوں نے میر کی یوں فکری تردید بھی روا نہیں جانی کہ جس کا مظاہرہ ''حافظ صہبا گسار'' کے ضمن میں کیا گیا ہے۔

اقبال اگر مرزا غالب کے تخیل کی بلند پروازیوں پر رشک کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ممدوحِ غالب یعنی میر تقی میر کی صد رنگ اور سدا رنگ شاعری اور اس میں روبہ عمل فنی طلسم کاری سے دامن کشاں رہے ہوں کہ بہ قول میر ''کارخانہ ہے واں تو جادو کا۔''

مرزا داغ کے مرثیے میں میر کی شاعرانہ عظمت پر اقبال کے کچھ تاثرات یوں ظاہر ہوئے ہیں:

جوہرِ معجز نمائی پا چکا جس دم کمال پھر نہ ہو سکتی تھی پیدا میر و مرزا کی مثال
کر دیا قدرت نے پیدا ایک دونوں کا نظیر داغ یعنی وصلِ فکرِ میرزا و دردِ میر

اقبال کا عہد اپنے سیاسی وسماجی منظر نامے کے حوالے سے میر کے زمانے سے بہت مختلف

تھا۔ اس دور میں جماعت بندی، قومیت پرستی، نوآبادکاروں کی مزاحمت کاری اور حریت پرستی کے جذبات اپنے عروج پر تھے۔ لہٰذا اس دور کی شعری تخلیقات میں تقلیدِ میر کا وہ عمومی رنگ پیدا ہونا تو ممکن ہی نہ تھا کہ جس کے امکانات صبح آزادی کے بعد لوگوں میں پنپنے والے ہجریائی موسموں، بیگانگی کے احساسات اور سہانے خوابوں کی تعبیر نہ ملنے پر مرگ آرزو کے کسک آمیز جذبوں کی بدولت پیدا ہو گئے تھے مگر واقعہ یہ ہے کہ انیسویں صدی میں نوآبادیاتی عہد کا یہ جمیع منظرنامہ اسی صورتِ حال کا پروردہ تھا جس کے بھرپور خدوخال عہدِ میر میں واضح ہو چکے تھے اور کلامِ میر کا ایک بڑا حصہ جس سے براہِ راست مخاطبہ کرتا ہے، لہٰذا ایسے بدلے ہوئے حالات کے باوصف مذکورہ دونوں شاعروں کے کلام میں فکر و نظر کے اختلاف کی وہ صورت نہیں بن پاتی جس کا تاثر ہمارے بعض ناقدین دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں سراج منیر کا یہ کہنا بڑا صائب معلوم ہوتا ہے کہ:

> ''زندگی کی ہر سطح اور اس کا ہر رنگ میر کے ہاں دکھائی دیتا ہے اور اس لیے اس کی معنویت اسی وقت نکلتی ہے جب ان سب رنگوں کو ملا کر اور ان سب وضعوں کو جوڑ کر ایک مکمل تصویر بنائی جائے۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ رفیع احمد خاں کی ہذلیات سے لے کر علامہ اقبال کی ملی شاعری تک اردو کا کوئی ایسا پیرایۂ اظہار نہیں ہے جس کا Archetype ہمیں میر کے ہاں دکھائی نہ دیتا ہو۔'' (۳)

اس بات میں شک نہیں کہ میر کے ہاں رنج والم، انفعالیت پذیری اور سماجی سطح پر بے جہتی کا احساس قدم قدم پر دامن گیر رہتا ہے جب کہ مقابلتاً اقبال کی شاعری میں امید و سرخوشی، جوشِ عمل اور تعینِ منزل کی سرشاری کے رنگ نمایاں ہیں مگر بادی النظر میں باہم متخالف نظر آنے والی ان دونوں احساساتی حالتوں میں متناقض عناصر کی کارفرمائی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ میر کا یہ مدعومہ رنج والم کسی شوپنہار کے قنوطی فلسفے سے پھوٹنے والا منفی جذبہ نہیں کہ جس کی ترجمانی ہمیں فانی بدایونی جیسے شعرا کے ہاں بہ خوبی ملتی ہے بلکہ اس کی نوعیت وہی ہے جسے اقبال کے ممدوح شاعر اکبر الہ آبادی نے ''مدرک حقائق'' قرار دیا تھا اور جسے اقبال خود بھی بجا طور پر بہت سراہتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میر کی شاعری میں زندہ دلی، آفاق گیری اور سیر چشمی کی ایسی کیفیات بھی بہ کثرت ملتی ہیں جنھیں اقبال کی شاعری کا طرۂ امتیاز قرار دیا جاتا ہے۔

علامہ اقبال نے ایک بڑے شاعر کی طرح اپنی شعریاتی روایت سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے عربی، فارسی، ہندی اور اردو شعرا سے گہرا ربط استوار کیے رکھا ہے۔ انھوں نے شرق و غرب کے متعدد نمائندہ تخلیق کاروں کی نگارشات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے فکر و فن کی تخلیقی اساس قائم کی ہے۔ ان کے ابتدائی دور کی بہت سی نظمیں شیلے، ایمرسن، جان ٹیلر اور ولیم کوپر جیسے شعرا سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح انھوں نے فارسی شعرا رومیؔ، فیضیؔ، صائبؔ، سعدیؔ، عرفیؔ، نظیریؔ اور غنی کاشمیریؔ وغیرہ سے بھی

بھرپور استفادہ کیا ہے۔ یہ بات خلافِ منطق معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے تخلیقی نوعیت کے ایجاب وقبول کی اس روش میں عجمی سرزمین کے اردو شعرا کو یکسر نظر انداز کیے رکھا ہو یا انھیں محض روایتی قسم کی مدح سرائی پر ٹالتے ہوئے ان سے استفادۂ فکر وفن کے سلسلے میں وہ ربط استوار نہ کیا ہو جو مغربی اور بالخصوص فارسی شعرا سے مخصوص خیال کیا جاتا ہے۔ دراصل ایسی غیر منطقی سوچ کے تانے بانے ہماری نوآبادیاتی ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں ورنہ کیسے ممکن ہے کہ غیروں کے احسانات اٹھانے سے باز رکھنے اور سفالِ ہند سے مینا و جام تشکیل دینے کی تبلیغ کرنے والا یہ بالغ نظر فلسفی دانش وحکمت کے مقامی خم کدوں کو اہمیت دینے کے لیے سنجیدہ نہ رہا ہو۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اقبال مقامی شعریات سے بھی گہرا لگاؤ رکھتے تھے اور یہاں یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کے زیرِ مطالعہ رہنے والے اردو شاعری کے اس ضخیم سرمائے میں میر تقی میر ایک نمایاں شاعر کے طور پر موجود تھے۔ یہ بات ضرور ہے کہ کلامِ اقبال پر میر یائی فکر وفن کے اثرات کی نوعیت ایسی بلاواسطہ طرز کی نہیں جیسی بالعموم مذکورہ مغربی یا فارسی شاعروں یا کسی حد تک اردو کے داغ دہلوی یا اکبر الہ آبادی جیسے شعرا کے حوالے سے سامنے آتی ہے تاہم کہیں کہیں یہ اثرات کافی نمایاں سطح پر بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر علامہ کی معروف نظم ''شکوہ'' کے چند اقتباسات کے مقابل میر کی ''واسوخت'' کے منتخب اشعار ملاحظہ کیجیے:

گوش کر میرے بھی شکوے کی طرف گل کے رنگ رکتے رکتے روشِ غنچہ ہوا ہوں دل تنگ
(میر)

.....

نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں ہمنوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
(اقبال)

.....

میں بھی ناچار ہوں اب منہ میں زباں رہتی نہیں (میر)

.....

نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم (اقبال)

.....

میں جو صحبت میں ہوں بیٹھا تو رکے بولو ہو آنکھیں ایدھر سے جو موندو ہو تو کم کھولو ہو
نام لیتے ہو کراہت سے مرا جو لو ہو لگ چلے غیر تو تابع اسی کے ہو لو ہو
روئے حرف اس کی طرف چشمِ حمایت اودھر
ابرو اودھر کو جھکے ، لطف و عنایت اودھر

اب اس کے مقابل ''شکوہ'' کے ایک بند میں شامل پہلے چار مصرعے دیکھیے:

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لب جو بیٹھے سنتے ہیں جام بہ کف نغمۂ کُو بہ کُو بیٹھے
دور ہنگامۂ گلزار سے یک سو بیٹھے تیرے دیوانے بھی ہیں منتظر ہُو بیٹھے

عہد میر میں نوآبادکاروں کی مقامی سماج میں پذیرائی پر کڑھتے ہوئے باطنِ ایّام سے آگاہ

تخلیق کاروں نے اپنوں کی کج فہمی اور عاقبت نااندیشی پر شدید احتجاج کیا ہے۔ اس دور کی شاعرانہ تخلیقات میں واسوخت رنگ کا نمایاں ہونا اسی نوع کی مزاحمت کاری کا شاخسانہ ہے۔ اردو غزل میں ''غیر'' کا کردار شروع سے ہی موجود رہا ہے تاہم مذکورہ عہد کی غزل میں در آنے والے اس کردار کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کے لیے اگر چند ایک نمائندہ شعرا کے ہاں اس کا استعمال اور اس کردار سے وابستہ تلازمات یا استعاراتی جہات کا جائزہ لیں اور پھر اسلوبیاتی اندازِ نقد کی روشنی میں اس کردار سے متعلق شعرا کی باطنی حسیات کا سراغ لگائیں تو بڑے اہم نتائج کا استخراج کیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ بالا تقابلی بندوں میں بھی اسی کردار کے حوالے سے شکوہ و شکایت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسی ضمن میں مزید ایک تقابلی مثال ملاحظہ کیجیے:

بس ہوس کیشوں سے مل مل کے تو بدنام ہوا (میر)

.....

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے (اقبال)

اس تقابلی مطالعے سے ظاہر ہے کہ دونوں نظمیں مثنوی کی ہیئت میں ہیں۔ میر کی واسوخت میں کل ۲۷ بند ہیں جب کہ اقبال کا ''شکوہ'' ۳۳ بندوں پر محیط ہے جسے مذکورہ تناظراتی تقابل میں پڑھا جائے تو انھی کی ایک سرگوشی:

''نکلی تو لبِ اقبال سے ہے کیا جانیے کس کی ہے یہ صدا''

کانوں میں گونجنے لگتی ہے۔ ان دونوں فن پاروں میں مستعمل طرزِ اظہار اور اسلوبیاتی پیٹرن بنانے والے فکر و فن کے مشترکہ عناصر سے عیاں ہوتا ہے کہ انھیں ایک ہی سکے کے دو رخ خیال کرنا چاہیے۔ محمد حنیف شاہد کی مرتبہ کتاب ''نذرِ اقبال'' میں سر عبدالقادر نے ''میر کی واسوخت اور اقبال کا شکوہ'' کے عنوان سے ایک وقیع مضمون لکھ کر میر و اقبال کے اس اہم فکری سنگھم پر اظہار خیال کیا ہے جسے بعد ازاں جدید ناقدین نے تجزیہ و تعبیر کی نئی بصیرتوں سے ہم آہنگ کر کے بڑے فکر انگیز نتائج اخذ کیے ہیں۔ الغرض ان تمام دلائل و براہین کی روشنی میں میرا مؤقف یہ ہے کہ میر تقی میر نے تخلیق کاری کے بعض کلیدی گوشوں میں اقبال کی پیشوائی (Anticipation) بھی ضرور کی ہے۔ علامہ اقبال کی فکری بنت کاری (Thinking Pattern) پر کلامِ میر کے اثرت کو نشان زد کرنے کے لیے چند پہلو خاص طور پر توجہ طلب محسوس ہوتے ہیں جو بالترتیب کچھ یوں ہیں:

۱۔ احساس خود شناسی
۲۔ فلسفۂ حرکت و عمل اور رزمیہ آہنگ
۳۔ تصورِ عشق
۴۔ مثبت اقدار و روایات کی ترجمانی
۵۔ آفاق گیر لب و لہجہ

۶۔عظمتِ آدم کا تصور

اب ہم ان چند مخصوص پہلوؤں کی مقرون تفہیم کے لیے دونوں شعرا کے کلام سے مثالیں لے کر ان کی فکر ونظر کے اشترا کی زاویوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ا۔احساسِ خودشناسی

علامہ اقبال کے کلام میں ہمیں ایک منظّم فکری نظام دیکھنے کو ملتا ہے اور اس نظامِ فکر کا محوری نقطہ اُن کا نظریۂ خودی ہے۔ علامہ نے ''خودی'' کا لفظ خودشناسی اور درکِ ذات کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ یہ ایک ایسا انقلابی فلسفہ ہے کہ جس کی ترویج واشاعت کے لیے کوئی قوم واقعتاً کمر بستہ ہو جائے تو اسے جوہری توانائی سے کہیں زیادہ قوت و جبروت اور مداومت واستقلال حاصل ہوسکتا ہے۔ اقبال نے اپنی دو طویل فارسی مثنویوں ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بے خودی'' میں اس حیات افروز زاویۂ نظر پر کھل کر بات کی ہے۔

جب ہم افکارِ اقبال کے اس کلیدی داعیے کا اصل ماخذ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں اس کے آثار عرب، ایران اور مغربی سرزمینوں میں تو ملتے ہیں مگر افسوس کہ عجمی دانش وحکمت کی طرف ہمارا دھیان تک نہیں جاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت علامہ نے خودشناسی اور عرفانِ ذات کے جس حکیمانہ نکتے کو تخلیقی پیراہن عطا کر کے ایک ادبی ارتفاع عطا کیا ہے، اس نورانی نکتے کے آثار میر کی شاعری میں بھی جا بہ جا دمکتے چمکتے محسوس کیے جاسکتے ہیں اور یوں بھی یہ کیسے فرض کیا جاسکتا ہے کہ ''پڑھ لیے میں نے علومِ شرق وغرب'' جیسا بلند بانگ دعوا کرنے والا وسیع النظر انسان اپنی ہی شعری روایت کے نمائندہ ترین تخلیق کار کی ایسی حکمت آموزیوں سے بے خبر رہا ہو۔ اس دعوے کی تائید ذیل کے اشعار سے بہ خوبی ہوسکتی ہے؛ تقابلی مطالعے کے لیے چند اشعار دیکھیے:

میر	اقبال
پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں	حسن کا گنج گراں مایہ تجھے مل جاتا
معلوم اب ہوا کہ بہت میں ہی دور تھا	تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل
مت سہل ہمیں جانوں پھرتا ہے فلک برسوں	ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں	بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
حقیقت نہ میرؔ اپنی سمجھی گئی	اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
شب و روز ہم نے تامّل کیا	کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

یہاں فکری ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ لفظیات، اسلوبِ بیان اور شعری آہنگ کی مماثلت

بالخصوص قابلِ توجہ ہے۔

۲۔فلسفۂ حرکت وعمل اور رزمیہ آہنگ

اگر ہم کلامِ میر کے فورگراؤڈنگ (Foregrounding) شعری موثرات سے پہلو بدل کر اس کے جمیع ادبی منظرنامے کا تجزیاتی مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کے ہاں ایک مخصوص رزمیہ آہنگ کا پورا نظامِ کار روبہ عمل ہے، تاہم المیہ یہ رہا کہ کلامِ میر کی ایسی جرأت آزما فکری ابعاد کی طرف بہ وجہ دھیان نہیں دیا جا سکا۔ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ سماجی فضاؤں سے غیر ہم آہنگ میر کا یہ لب ولہجہ ایسا ہے کہ جس کی کشید صرف اور صرف خونِ دل کے اصراف پر منحصر تھی اور انیسویں صدی کا حسرت آیات عمرانی منظرنامہ جس کی بلوغت کے لیے قطعی غیر موید تھا۔ میر کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے ایسے حالات میں بھی نہ صرف اپنا دبنگ اور پرزور مزاحمتی پیرائیہ بیان جاری رکھا بل کہ اپنے مابعدی شاعروں مثلاً مولانا ظفر علی خاں، محمد علی جوہر اور علامہ اقبال وغیرہ کو اسے مزید بلندیوں سے ہم کنار کرنے کی راہ سدھائی ہے۔ ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے میر کے اس رنگِ سخن کی نشان دہی کرتے ہوئے بہ جا طور پر لکھا ہے کہ:

''میر کلاسیکی شاعروں کی طرح مزاحمتی شاعری کے بھی سرخیل ہیں۔''(۴)

بیسویں صدی کی شعری روایت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ میر کی مذکورہ طرزِ سخن کو بالخصوص علامہ اقبال نے اوجِ کمال سے آشنا کر دکھایا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ میر کے ہاں رزم و بزم کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے جب کہ اقبال تک آتے آتے اس امتزاجی خاصیت پر محض رزم آرائی کا رنگ وآہنگ غالب آ گیا، لہٰذا ایسے میں ان دونوں شعرا کے کلام میں فکر ونظر کے بعض اہم پہلوؤں میں افتراکات کا در آنا یقینی تھا۔

علامہ اقبال کا تو جملہ کلام ہی حرکت وعمل اور جوش وجذبے سے عبارت ہے لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحصیلِ حاصل سے بچنے کے لیے ان کے اشعار کو 'فی بطن القاری' فرض کرتے ہوئے ان کے مقابل محض کلامِ میر سے تقابلی اشعار کے انتخاب پر قناعت کی جائے، لہٰذا ملاحظہ کیجیے کچھ بیتیں چیدہ چیدہ:

برسے اگر شمشیر سروں پر منہ موڑیں زنہار نہیں
سیدھے جانے والے اودھر کو کس کے پھیرے پھرتے ہیں

.....

ہم دور ماندگاں کی منزل رساں مگر اب
یا ہو صدا جرس کی یا گردِ کارواں ہو

.....

تا چند کوچہ گردی جیسے صبا زمیں پر
اے آہِ صبح گاہی آشوبِ آسماں ہو

.....

ہاتھی مست بھی آوے چلا تو اس سے منہ کو پھیر نہ لیں
پھرتے ہیں سرمست محبت مے نا خوردہ ماتے ہم

.....

آہن دلوں نے مارا ہے جی غم میں ان کے ہم
پھرتے ہیں لعل سینوں پہ اپنے جڑے ہوئے

.....

منہ پر اس کی تیغِ ستم کے سیدھا جانا ٹھہرا ہے
جینا پھر کج دار و مریز اس طور میں ہوٹک یا مت ہو

دراصل ایسے ولولہ انگیز، مبارزت طلب اور استقامت نشاں اشعار کے پیشِ نظر ہی ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار جیسے نکتہ شناس دانش ور نے کلامِ میر کو فکرِ اقبال کا پیش رو خیال کرتے ہوئے صراحت کی تھی کہ میر کے ان اشعار میں علامہ اقبال سے ڈیڑھ سو سال قبل وہی خود اعتمادی اور جواں مردی نظر آتی ہے جس کا مظاہرہ عہدِ اقبال کے شاعرانہ منظر نامے کا اختصاص بنا۔(۵)

۳۔تصورِ عشق

عشق و عاشقی اردو شاعری کے ہمہ جہتی اظہاری قرینوں میں مرکزی حیثیت کا حامل قرینہ ہے۔ اگرچہ شعرا نے چمنیات، خمریات اور حبسیات جیسے اظہاری ذرائع سے بھی بھرپور تخلیقی ربط استوار کرنے کا ثبوت دیا ہے مگر اس کے باوجود ہمہ نوعی اظہاری بیانیوں اور لطیف سے لطیف تر جذبات و احساسات کی ترسیل کا جو اظہاری نظام کارِ عاشق، معشوق اور رقیب کی تثلیث اور اس کی لاتعداد نسلوں کی جہتوں سے مل کر ترتیب پاتا ہے اس کی مثال کسی اور قرینۂ اظہار سے دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اس نظامِ اظہار کی ابلاغی امکانیت اس قدر زیادہ ہے کہ دنیا بھر کے شعرا اسی کی طرف راجع رہتے ہیں۔

یہ بات حیران کن ہے کہ عشق کا لفظ عربی الاصل ہونے کے باوجود جاہلی شاعری یا قران و حدیث میں کہیں نہیں ملتا بل کہ اس کی جگہ ''حب'' اور ''محبت'' کے الفاظ مستعمل رہے ہیں۔ علمائے لغت اس لفظ کو ''عشقہ'' سے ماخوذ بتاتے ہیں جس سے مراد عشق پیچاں یعنی آکاس بیل لی جاتی ہے۔ اس طفیلی بیل کی خاصیت یہ ہے کہ یہ جس بھی پیڑ پودے سے لپٹ جائے اس کا رس نچوڑتی اور اسے بہ تدریج موت کی زردی سے دوچار کر کے خشک کیے دیتی ہے۔ آکاس بیل کی یہی مخصوص کارگزاری اسے انسانی ربط و تعلق کی ایک خاص کیفیت معنون بہ ''عشق'' کا غماز بنا دیتی ہے۔ اردو کے جملہ شعرا نے اس آفاق گیر جذبے اور اس کی نوع بہ نوع ذیلی کیفیتوں کا بھرپور تذکرہ کیا ہے۔ لہٰذا سراج منیر نے اس ضمن میں

تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''میر کے ہاں عشق کا تصور اردو میں مستعمل اس جذبے یا کیفیت کی تمام جہتوں کا محیط ہے۔ افکارِ میر کے مطابق اس کی نوعیت ایک باطنی ریاضت کی سی ہے اور یہی ریاضت اس پر خلوص دردمندانہ جوہر (Essence of Tragedy) کا منبع ہے جو ان کی شاعرانہ فکر میں روح کا درجہ رکھتا ہے۔''(۶)

عشق و محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس سے نفسِ انسانی میں پائے جانے والے شر پسندانہ رجحانات و امکانات عملِ استحالہ (Metabolism) سے گزر کر خیر و برکت اور اصلاح و فلاح میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ چناں چہ صوفیائے کرام جب کسی سالکِ راہ کو تزکیۂ نفس کی تعلیم دیتے ہیں تو اولاً اسے عشق و محبت اختیار کرنے کا درس دیتے ہیں۔ میر کے صوفی منش والدِ گرامی نے انھیں نصیحت کرتے ہوئے یہی فرمایا تھا کہ:

''اے پسرِ عشق بوذر۔ عشق است کہ دریں خانہ متصرف است۔''(۷)

میر نے عشق سے ایک ارفع و اعلیٰ جذبہ مراد لیا ہے جو تہذیبِ نفس کا باعث بنتا اور انسان کے لیے آفاق گیری کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ کلامِ میر میں تصورِ عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ میر نے اس آفاقی جذبے کے متعلقات و نتائج پر ہر زاویے سے بات کی ہے۔ اس مقبول عام سماجی تصور کے پیشِ نظر کلامِ اقبال پر نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں بھی عشق و جنوں کا یہ فکر و فلسفہ ایک کلیدی قدر کا حامل ہے۔ دیکھا جائے تو کلامِ اقبال میں روح کی طرح حلول کر جانے والا تصورِ عشق بھی میر تقی میر کے اسی جامع تہذیبی جذبے کا ایک ارتقا یافتہ پہلو محسوس ہوتا ہے۔ اس ضمن میں دونوں شعرا کے کلام سے چند تقابلی امثلہ ملاحظہ فرمائیں:

عشق تھا جو رسول ہو آیا ان نے پیغام عشق پہنچایا (میر)

.....

کیا حقیقت کہوں کہ کیا ہے عشق حق شناسوں کے ہاں خدا ہے عشق
اور تدبیر کو نہیں کچھ دخل عشق کے درد کی دوا ہے عشق
عشق سے جا نہیں کوئی خالی دل سے لے عرش تک بھرا ہے عشق
کون مقصد کو عشق بن پہنچا آرزو عشق مدعا ہے عشق (میر)

.....

ارض و سما میں عشق ہے ساری چاروں اور بھرا ہے عشق ہم ہیں جناب عشق کے بندے نزدیک اپنے خدا ہے عشق
ایک طرف جبریل آتا ہے، ایک طرف لاتا ہے کتاب ایک طرف پنہاں ہے دلوں میں، ایک طرف پیدا ہے عشق
(میر)

اب مذکورہ تصورِ عشق کے مقابل علامہ اقبال کے فلسفۂ عشق کی مختلف جہات ملاحظہ کرنے

کے لیے مندرجہ بالا شعری اقتباسات کے تقابل میں بالترتیب کلامِ اقبال کی چند مثالیں دیکھیے :

عشقِ دم جبرئیل ، عشق دل مصطفٰے عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام
عشق فقیہہ حرم ، عشق امیر جنود عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

.....

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر کبھی مولا علی خیبر شکن عشق

.....

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق کبھی شاہِ شہاں نوشیرواں عشق
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش کبھی عریاں و بے تیغ و سناں عشق

اس تقابلی مطالعے میں صاف ظاہر ہے کہ اقبال کا معروف تصورِ عشق اپنی آفاق گیری، ہمہ جہتی اور زمانی و مکانی وسعت پذیری میں میر کے تصورِ عشق سے پوری طرح ہم آہنگ محسوس ہوتا ہے۔

۴۔ آفاق گیر لب و لہجہ

میر اور اقبال کے زاویۂ نظر کی آفاق گیری انھیں ایک ایسے رشتۂ ارتباط میں پرو دیتی ہے جس کے سامنے اندازِ نظر اور معنوی سروکار کا اختلاف بہت حد تک ناقابلِ اعتنا محسوس ہونے لگتا ہے۔ ایک بلند تر درجے کا شاعر اپنی تخیلاتی قوت کے زور سے پوری کائنات کو حباب سا سمیٹ کر اپنے محیطِ ادراک میں بہ خوبی سمو لیتا ہے اور اس کی یہ وسعت آشنائی محض مکانی تصرفات کے اظہار تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ ازل سے ابد تک کا پورا زمانی دورانیہ بھی اس کے ایک لمحۂ عرفان میں سمٹ آتا ہے۔ وہ اپنے تنگ و تاریک حجرے میں بیٹھ کر تحت الثریٰ سے عرش الٰہ تک بہ آسانی دسترس حاصل کر لیتا ہے نیز اسے اپنے زمانی تصرفات کے توسط سے ''کن فیکون'' جیسا اولین اساطیری وقوعہ بھی محض کل کی بات معلوم ہونے لگتا ہے۔ ایسے وسیع حسّی وادراکی امکانات کی بنا پر وہ اپنے نجی معاملات کو آفاقی تجربے میں ڈھالنے یا پھر کسی آفاق گیر واقعے کو ایک نجی واردات کا روپ دینے پر پوری طرح قادر ہوتا ہے اور مذکورہ دونوں عظیم شعرا کے ہاں ایسا ارتقائی تخلیقی رویہ بہ غایب درجے کا اشتراکی رنگ رکھتا ہے۔

میر نے اپنی فکر و نظر کو آفاقیانے (To Universalize) میں کمال درجے کی مہارت کا ثبوت دیا ہے جب کہ علامہ اقبال نے فکری آفاقیت گیری کے اسی اسلوب بیان کو ایک خاص تناظر میں ڈھال کر پیش کرنے میں دل چسپی دکھائی ہے۔ میر کی اس طرزِ خاص کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے ڈاکٹر نصرت چودھری نے لکھا ہے کہ:

> ''میر نے اپنی شاعری میں غم و الم کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ وہ اجتماعی احساس کا حصہ بن گئے ہیں۔۔۔۔ وہ اپنے ذاتی احساس کو اجتماعی احساس کے ذریعے

بیان کر کے ایک نئی صورت عطا کرتے ہیں۔''(۸)

اگر تقابلی تناظر میں دیکھا جائے تو میر اور اقبال دونوں اپنے علوئے تخیل میں کائناتی شخصیت کا روپ اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔اس ضمن میں چند شعری مثالیں ملاحظہ کیجیے:

میر	اقبال
ہنگامہ گرم کن جو دل ناصبور تھا	میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
پیدا ہر ایک نالے سے شور نشور تھا	غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں
دامانِ کوہ میں جو میں داڑھ مار رویا	ابر نیساں یہ تنک بخشی شبنم کب تک
اِک ابر واں سے اٹھ کر بے اختیار رویا	مرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی
رویا کیے ہیں غم سے ترے ہم تمام شب	پردہ چہرے سے اٹھا انجمن آرائی کر
پڑتی رہی ہے زور سے شبنم تمام شب	چشمِ مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر
میں گریۂ خوبی کو روکے ہی رہا ورنہ	ابر رحمت دامن از گلزار من برچیدو رفت
اک دم میں زمانے کا یاں رنگ بدل جاتا	اند کے برغنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

دراصل بڑی شاعری میں روبہ عمل فکر ونظر کی نوعیت ہی ایسی ارتفاع یافتہ ہوتی ہے کہ اس میں کوئی جذبہ یا خیال انفرادی دائرہ کار کی حدود میں کم ہی مقید رہ پاتا ہے۔متنی حصار میں آتے ہی اس پر آفاقی اور اجتماعی تفکر کی فردیت گریز قوتیں بہت شدت سے عمل کرنے لگتی ہیں۔مذکورہ دونوں شعرا کے کلام میں آفاقیت مائل فکری رجحان کا یہ اسلوبیاتی اشتراک ان کے اندازِ نظر کی بعض مماثل جہتوں کا آئینہ دار ہے۔اردو کے ان دونوں بڑے شاعروں کی آفاق گیریت میں وحدتِ انسانی، عالم گیر بھائی چارے اور بے لاگ انسان دوستی جیسے تصورات بھی ایک اہم اشتراکی عامل کے طور پر موجود رہتے ہیں۔علامہ اقبال کے مسلم قومیت کے تصور پر بسا اوقات یہ اعتراض اٹھایا جاتا ہے کہ انھیں عالمی بھائی چارے کے بہ جائے صرف مسلمان قوم کی اخوت ویگانگت سے سروکار تھا مگر یہ تاثر دراصل ان کے کلی فکری نظام سے کم اعتنائی برتنے کا شاخسانہ ہے، ورنہ صورتِ واقعی یہ ہے کہ ان کے ہاں عالمی اخوت ویگانگت کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر نکلسن کے نام ان کے ایک خط کا حوالہ ملاحظہ کیجیے:

> "In the interest of a universal unification of mankind the Quran ignores their minor differences, and says "Come let us unite on what is common to us all."(9)

ڈاکٹر آفتاب احمد نے ایک جگہ میر اور اقبال کے عالم گیر اخوت و رواداری کے ایسے تصورات کو وحدت الوجود اور وحدت الشہود جیسے فلسفوں کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا حاصلِ مطالعہ یہ ہے کہ مغل دورِ حکومت میں جب قوت و سطوت مسلمانوں کا مقدر تھی تو ایسے میں وحدت الوجود کا فکر و فلسفہ رو بہ عمل رہا جس کی رو سے رواداری، روشن خیالی اور بے تعصّبانہ باہمی یگانگت کے رویے پروان چڑھے تاکہ اس سے اسلام کے فروغ اور مسلمانوں کی عددی قوت میں اضافے کے در وا ہو سکیں مگر جب عہد مغلیہ زوال پذیر ہوا اور بنا بریں مسلمانوں کی طاقت کا شیرازہ بکھرنے لگا تو ایسے میں خود نگہداری اور قومی تشخص کا موید فلسفۂ وحدت الشہود رو بہ عمل آیا۔(۱۰) واضح رہے کہ وحدت الوجود میں اخذ و انجذاب جب کہ وحدت الشہود میں تطہیر و تزکیہ کا اصول کارفرما رہتا ہے۔ دراصل یہاں فاضل تجزیہ کار نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ میر اور اقبال اپنے اپنے زمانی تناظر کے حوالے سے انھی دو فلسفوں کے پیروکار رہے ہیں؛ میر وحدت الوجودی تھے جب کہ علامہ اقبال وحدت الشہودی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ سیاسی حرکیات کی پیدا کردہ اجتماعی حسّیت یا پھر عہدِ اقبال میں سامنے آنے والی قومی تشخص کی تحریک پر یوں دوٹوک انداز میں مختلف فکری منہجوں کا اطلاق کرنا کسی طرح موزوں نہیں کیوں کہ مسلمانوں کی پوری فکری تاریخ میں اپنے جداگانہ تشخص پر اصرار کے باوصف انسانی بھائی چارے کی اشتراکی قدر ہر زمانے میں متحرک اور فعال رہی ہے اور اسی ملے جلے زاویۂ نظر کی مثالیں ہمیں زیرِ بحث دونوں شعرا کے کلام میں ملتی ہیں۔ آیئے اب ذرا ان دونوں عظیم شعرا کی آفاق گیر حسّیات پر مبنی کچھ اشعار دیکھتے ہیں؛ پہلے میر کے دو اشعار:

مسلم و کافر کے جھگڑے میں جنگ و جدل سے رہائی نہیں
لوتھوں پہ لوتھیں گرتی رہیں گی کٹتے رہیں گے سر کے سر

.....

اس کے فروغ حسن سے چمکے ہے سب میں نور
شمع حرم ہو یا کہ دیا سومنات کا

.....

اسلامی کفری کوئی ہو ہے شرط دردِ عشق
دونوں طریق میں نہیں ناکارہ دردمند

اب ان کے مقابل فکرِ اقبال کا رنگ ملاحظہ ہو:

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

.....

مشرق سے بے زار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

.....

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

۵۔عظمتِ آدم کا فکر و فلسفہ

انسان اس وسیع کائنات میں ایک کلیدی کردار کی حیثیت رکھتا ہے اور فلاسفۂ عالم نے اس کی یہ حیثیت بہ کثرت اپنا موضوعِ بحث ٹھہرائی ہے۔ جدید دور میں وجودی فلسفے کے زیرِ اثر جدیدیت کی تحریک منظرِ عام پر آئی جس میں انسان کو وراء الورا ہستی کے روپ میں دیکھا گیا اور یوں انسان پرستی (Humanism) عہد رواں کی سب سے نمایاں عمرانی قدر خیال کی جانے لگی۔ افلاطون کا ''فیلسوف''، ارسطو کے ''مثالی انسان''، جرمن فلاسفر نطشے کا ''فوق البشر'' (Super Man) اور ایمرسن کے ''انسان بالا'' (Over Man)، جیسے تصورات اسی آئیڈیل انسان کے ارتقائی تخیلاتی خدوخال ہیں۔ علامہ اقبال کا تصورِ ''مردِ مومن'' اسی نوع کے مثالی انسان کی ایک منفرد مثال ہے۔ دیکھا جائے تو میر کی شاعری میں بھی انسانی عظمت و سطوت کی متعدد صورتیں ان کے تخلیقی کینوس پر پھیلی ہوئی ہیں اور اپنی بعض خصوصیات میں میر کا تصورِ انسان فکرِ اقبال کی سیادت کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس ضمن میں کلامِ میر سے چند مثالیں دیکھیے:

خدا ساز تھا آذرِ بت تراش ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں

.....

حقیقت نہ میرؔ اپنی سمجھی گئی شب و روز ہم نے تامّل کیا

.....

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے سینے سے انسان نکلتے ہیں

.....

آدمِ خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ آئینہ تھا یہ ولے قابلِ دیدار نہ تھا

.....

صیادی میں علوئے تقدّس تو اس کا دیکھ روح القدس کو مار رکھا ہے شکار کر

اب اسی نوع کی انسانی عظمت کے ذیل میں اقبال کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

.....

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

.....

حسن کا گنجِ گراں مایہ تجھے مل جاتا تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

.....

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

.....

قدم در جستجوئے آدمی زن خدا ہم در تلاشِ آدمی ہست

۶۔مثبت اقدار و روایات کی ترجمانی

علامہ اقبال کو ان کی فکری قیادت کی وجہ سے بالعموم حکیم الامت اور مفکر اسلام جیسے القابات سے یاد کیا جاتا ہے۔انھوں نے خود بھی اپنی شعر گوئی کو ''چند مقاصدِ خاص'' کے حصول کا ذریعہ گردانا تھا مگر واقعہ یہ ہے کہ بسا اوقات یہ ''مقاصد خاص'' ان کے تخلیقی طرز اظہار پر اس قدر گراں ہو گئے ہیں کہ ان کے بوجھ تلے بعض لطیف ادبی قدریں بھی دبنے لگتی ہیں۔یہ تشویش ناک صورتِ حال ان کی آخر العمر کی تخلیقات میں عام دیکھنے کو ملتی ہے۔البتہ مجموعی طور پر ان کا یہ اعزاز ضرور ہے کہ انھوں نے یہاں ادبی لوازمات سے بہت کم سروکار رکھتے ہوئے بھی اپنے نظریات و افکار کو اس ادیبانہ مہارت سے پیش کیا ہے کہ ان پر ایک مخصوص ادبی ہالہ سا چڑھا محسوس ہوتا ہے۔سماجی فلاح و اصلاح کے لیے مثبت اقدار و روایات اور حکیمانہ اسرار و رموز کی ترویج و اشاعت کے لیے میر نے یہی کام ادبی شعریات کے اندر رہ کر سرانجام دیا ہے۔میر نے اقبال کے ایسی سماجی و معاشرتی اقدار و روایات کی ترجمانی کچھ اس انداز سے کی ہے کہ اس میں واعظانہ یا خطیبانہ رنگ کم اور درد و سوزِ آرزومندی کا ادیبانہ احساس زیادہ شدت سے محسوس ہونے لگتا ہے۔جگن ناتھ آزاد ایک جگہ لکھتے ہیں کہ معروف شاعر اور ادبی دانش ور درگا سہائے فراق گورکھ پوری نے ایک دفعہ میر اور اقبال کے باہمی فکری اشتراکات کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''اقبال کے یہاں جو درد و گداز کی لہر ہے وہ میر کے سوا اور کسی شاعر میں نہیں ملتی۔
ان کا کلام پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔''(۱۱)

ظاہر ہے کہ اگر علامہ موصوف کے کلام میں درد و سوز کی رو ہے تو میر جو سراپا درد و غم کی منڈکری ہیں، کیوں کر فنی طور پر ان کے ہم طرز نہ ٹھہریں گے۔اب ان دونوں شعرا کے کلام سے مثبت اقدار و روایات کی ترجمان کچھ مثالیں دیکھیے:

میر	اقبال
مل اہل بصیرت سے کچھ وے ہی دعا دیں گے	تمنا دردِ دل کی ہے تو کر خدمت فقیروں کی
لے خاک کی کوئی چٹکی اکسیر بنا دیں گے	یدِ بیضا لیے پھرتے ہیں اپنی آستینوں میں

.....

شیخ پڑھے محرابِ حرم میں پہروں دوگانہ پڑھتے رہو — یہ مصرعہ لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ منبر پر
سجدہ ایک اس تیغ تلے کا ان سے ہو تو سلام کریں — یہ غافل گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

.....

تحصیل علم کرنے سے دیکھا نہ کچھ حصول — پڑھ لیے میں نے علومِ شرق و غرب
میں نے کتابیں رکھیں اٹھا گھر کے طاق میں — روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

.....

ہو جو منت سے تو کیا وہ شب نشینی باغ کی — اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
کاٹ اپنی رات کو خار و خسِ گلخن جلا — سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

سماجی تعلیمات اور تہذیبی قدروں سے متعلق مندرجہ بالا تقابلی اشعار کی فنی بنت کاری پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ علامہ نے بالعموم جن امور کو فکر و نظر کی پوری سنجیدگی کے ساتھ اظہاری سطح پر اجاگر کیا ہے، میر انھیں ایسے احساسات میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں کہ جن میں ذہن کی فعال کارفرمائی محسوس تو ہوتی ہے مگر اس کی حیثیت ایک حاوی عامل کی سی نہیں رہتی۔ دراصل یہی وہ قرینۂ اظہار ہے جس سے تخلیقی جمالیات کی بنیادی خاصیت ظاہر ہوتی ہے اور بلاشبہ ہماری کلاسیکل شعریات اس اظہاری رویے پر اصرار بھی کرتی رہی ہے۔ میر کے اشعار پہلے دل کو لگتے ہیں اور دماغ تک ان کا معنوی ارتعاش بعد میں کہیں پہنچتا ہے، جب کہ کلامِ اقبال میں معنوی تاثیرات کی قلب و ذہن تک ترسیل کا معاملہ اس سے بہت حد تک مختلف محسوس ہوتا ہے۔ معروف ادبی فلاسفر احمد جاوید نے میر کی مذکورہ احساساتی طرزِ تخلیقیت کو ان کی شاعرانہ عظمت کا کلیدی پتھر قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> ''غالب اور اقبال جن امور کو فکری اور نظریاتی آہنگ کے ساتھ اظہار دیتے ہیں، میر ان کو ایسے احساس میں ڈھال دیتے ہیں جس میں ذہن بھی پوری طرح موجود ہوتا ہے۔ یہ وہ مرتبہ ہے جو عقل کو انتہائی مطلوب ہے مگر وہ یہاں تک رسائی نہیں رکھتی۔'' (۱۲)

علامہ اقبال کی شاعری پڑھتے ہوئے بعض اوقات میر کے کسی شعر کی فکری یا فنی فضا کا تاثر ملتا ہے اور کئی مواقع تو ایسے آتے ہیں کہ علامہ کا کوئی شعر پڑھتے ہی میر کا کوئی مصرعۂ تر یا شعر شور انگیز پوری صحت سے ہمارے دماغ میں کسمسانے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کی چند تقابلی مثالیں دیکھیں:

میر	اقبال
ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا	مری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
پیدا ہر ایک نالے سے شور نشور تھا	غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

.....

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا	حقیقت ایک ہے سب کی خاکی ہوں کہ نوری ہوں

خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا لہو خورشید کا ٹپکے گا گر ذرے کا دل چیریں

.....

فریاد انھی رنگوں ہے گلزار میں ہر صبح اڑالی طوطیوں نے ،قمریوں نے ،عندلیبوں نے
بلبل نے مری طرز سخن صاف اڑائی چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

.....

زنی تا چشم برہم ، مہر رنگ کینہ می گرد نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
مروت آشنائی نیست ہر گز خوش نگاہاں را نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

.....

بوسیدنِ دہانِ تو در دل خیال داشت ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
ایں سادہ لوح خواہشِ امرِ محال داشت مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

.....

اے عدم ہونے والو تم تو چلو کہتا ہے مجھ سے دشتِ جنوں میں خضر کہ چل
ہم بھی اب کوئی دم میں آتے ہیں آتا ہوں میں بھی پاؤں سے کانٹا نکال کے

واضح رہے کہ دیگر بہت سے اشعار کی طرح اقبال کا یہ آخری شعر بھی صرف اپنے فکری مواد میں ہی متقابل دیے گئے میر کے شعر سے مطابقت نہیں رکھتا بل کہ اس کی لفظیات بھی بڑی حد تک اس سے مماثلت رکھتی ہے۔مزید برآں اس میں مستعمل ترکیب ''دشتِ جنوں'' بھی اسلوب میر سے ماخوذ ہونے کا شائبہ رکھتی ہے۔کیوں کہ میرؔ کا مذکورہ شعران کے پہلے شعری دیوان میں آیا ہے اور نون غنّہ کی ردیف والی اس غزل سے اگلی غزل میں یہ ترکیب یوں استعمال ہوئی ہے:

جاتا ہوں میر دشتِ جنوں کو میں اب یہ کہہ
مجنوں کہیں ملے تو تری بھی دعا کہوں

میر اور اقبال میں ایک فکری مماثلت یہ ہے کہ دونوں نے اپنی مؤثر تخلیقات میں بچوں کے ادب پر متناسب توجہ صرف کی ہے۔میر نے اپنی بہت سی نظمیں کتے، بلی، بکری، مرغ اور کھٹمل وغیرہ پر لکھی ہیں جو بچوں کے شعری ادب کا ایک وقیع سرمایہ ہیں۔ان منظومات کے علاوہ انھوں نے اپنے بچوں کی نصابی ضروریات کے پیش نظر ''فیض میر'' کے عنوان سے ایک کتابچہ بھی تحریر کیا تھا جس میں چھوٹے بچوں کی نفسیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہلکی پھلکی تدریسی باتیں اور لطائف وغیرہ شامل تھے۔اسی طرح اقبال نے اپنے ابتدائی شعری مجموعے ''بانگِ درا'' میں بہت سی نظمیں بالخصوص بچوں کے لیے تحریر کی ہیں۔ان نظموں میں ''گائے اور بکری''، ''پہاڑ اور گلہری'' اور ''بچے کی دعا'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔اس کے علاوہ ان دونوں شاعروں کے کلام میں طنز و مزاح کا عنصر بھی ایک مشترکہ خصوصیت کے خدوخال ابھارتا ہے۔محمد حسین آزاد کی سحر کار نکتہ آفرینیوں کے زیرِ اثر ایک مدت تک میر کو محض ''درد و غم کا شاعر'' قرار دیا

جاتا رہا مگر معاصر تنقید نے اس یک سطحی تاثر کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے فکاہی اور مزاحیہ پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے جس سے اقبال اور میر کے اشتراکِ فکر وفن کا ایک اور پہلو منظر عام پر نمایاں ہو چکا ہے۔ دراصل میر تقی میر ہماری شعری تاریخ کے وہ مہان تخلیق کار ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو ایک ہمہ گیر تخیلاتی پیٹرن عطا کرنے میں بڑی کامیابی دکھائی ہے۔ ہماری شاعری کی مزید نشو وارتقا اسی پیٹرن میں رہتے ہوئے ایسا تانا بانا تیار کرنے سے متعلق رہی ہے۔

میرؔ کا فکر وفن ہمارے تخیلاتی لاشعور میں آج بھی پوری آب وتاب سے مثالِ بحر موجیں مار رہا ہے۔ بلاشبہ علامہ اقبال کی شاعری بھی میرؔ کے دریائے سخن سے اٹھنے والی ایک ایسی موجِ تند جُولاں ہے جس نے اپنی فکری حشر سامانیوں اور فنی نازخرامیوں سے اس دریا کے بعض حیات افروز امکانات کو عملی شکل دی ہے۔ اس ضمن میں سراج منیر لکھتے ہیں کہ:

> ''کوئی بھی شاعری کسی ایک شاعر میں اپنی ساری وضعیں تلاش کر لیتی ہے اور پھر بعد کے آنے والے شاعر انھی وضعوں کو اجمال سے تفصیل میں منتقل کرتے ہیں اور روایت کا صحیح تصور بھی یہی ہے کہ آیا کوئی اجمالی وضع کسی بڑے تفصیلی پیٹرن کا حصہ ہے یا نہیں، یا کوئی تفصیل اپنے سے پہلے کے شعری منظر میں کسی اجمالی شکل سے متعلق ہے یا نہیں۔ ادبی روایت دائرہ در دائرہ پھیلتی ہوئی انھی شکلوں کا نام ہے اور اردو میں اس کا مرکزی نقطہ میر ہے۔''(۱۳)

الغرض اردو شاعری کی موجودہ صورتِ حال میں میر کی موجِ صد رنگ کے مختلف شیڈز بکھرے نظر آتے ہیں اور ان میں اقبالی رنگ کچھ زیادہ چوکھا ہونے کی بنا پر ایک غالب حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

ان جملہ معروضات کا ماحصل یہ ہے کہ اگر بدیہی طور پر اقبال اور میر کے فکر وفن میں واضح مطابقت کے کچھ بھی آثار نظر نہیں پڑتے مگر فی الحقیقت کلامِ میر کے کچھ فکری وفنی مؤثرات اقبالیاتی سرمائے پر اپنی چھاپ ضرور بنائے ہوئے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ضیاء الحسن، ڈاکٹر، غزل اور غزل کی تنقید، مشمولہ: سیپ، ماہنامہ، شمارہ ۷۵، کراچی، خاص نمبر، ۲۰۰۶ء، ص: ۱۸۱

۲۔ آزاد، جگن ناتھ، کچھ فراق کے بارے میں، مشمولہ: اقبالیات ۱۴، سری نگر: اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، ۱۹۸۸ء، ص: ۸۶

۳۔ سراج منیر، مقالاتِ سراج منیر، مرتبہ: محمد سہیل عمر، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۰ء، ص: ۲۶۷

۴۔ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر، جنگِ آزادی کے اردو شعرا، اسلام آباد: قومی ادارہ برائے تحقیق وتاریخ وثقافت،

۱۹۸۶ء، ص:۳۷۶

۵۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، ایہام گو اور دیگر شعرا، مشمولہ: تاریخِ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد ۸، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء، ص:۱۳۷

۶۔ سراج منیر، مقالاتِ سراج منیر، مرتبہ: محمد سہیل عمر، ص:۲۹۷

۷۔ نثار احمد فاروقی (مترجم)، میر کی آپ بیتی، لاہور: مجلس ترقی ادب، س ن، ص:۵۰

☆ ترجمہ: ''اے بیٹا عشق اختیار کر کہ عشق ہی اس کارخانے میں متصرف ہے۔''

۸۔ نصرت چوہدری، ڈاکٹر، فیض احمد فیض: روایت اور انفرادیت، نئی دہلی: سیمانت پرکاش، ۱۹۹۵ء، ص:۷۰

۹۔ مکتوب محمد اقبال بنام ڈاکٹر نکلسن

۱۰۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر، میر، غالب اور اقبال (تین صدیوں کے تین شاعر)، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص:۱۶

۱۱۔ آزاد، جگن ناتھ، کچھ فراق کے بارے میں، مشمولہ: اقبالیات ۱۴، ص:۸۶

۱۲۔ احمد جاوید، میر کی عظمت کا ایک سبب، مشمولہ: دنیا زاد، کتابی سلسلہ نمبر ۱۶، مرتبہ: آصف فرخی، کراچی: شہرزاد، جنوری ۲۰۱۶ء، ص:۶۴

۱۳۔ سراج منیر، مقالاتِ سراج منیر، مرتبہ: محمد سہیل عمر، ص:۲۵۷

☆.....☆.....☆